اسلامی تحریکیں اور حزب اختلاف کا کردار

پروفیسر ممتاز احمد
ترجمہ: طیب ابو عادل

اسلامی تحریکیں، مغرب کے غور و فکر کا موضوع ہیں۔ مغربی لٹریچر میں اس کے لیے "سیاسی اسلام" (Political Islam) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ مڈل ایسٹ پالیسی کے جنوری ۹۷ کے شمارے میں مڈل ایسٹ پالیسی کونسل کے زیر اہتمام سینیٹ کے دفتر کی عمارت میں منعقدہ گیارہویں کیپٹل ہل کانفرنس کی روداد Political Islam: Can it Become A Loyal Opposition کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں ہیمپٹن (Hampton) یونی ورسٹی کے پاکستانی پروفیسر ممتاز احمد کا خطاب اور سوال جواب ایک نقطہ نظر کے طور پر ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

ایک جمہوری حزب اختلاف کا وجود اس بات کا پیشگی تقاضا کرتا ہے کہ جمہوری نظام قائم ہو، جائز اور آئینی حکومت کام کر رہی ہو اور اس بات کا امکان موجود ہو کہ کبھی کسی ایک پارٹی کو اکثریت حاصل ہو، کبھی کسی دوسری پارٹی کو۔ جمی جمائی اور مستقل نوعیت کی اکثریتیں جو مختلف مسلمان ممالک میں حکمران نظر آتی ہیں، نہ ہوں۔ مثلاً شام اور عراق میں پچھلے چالیس سے بھی زیادہ برسوں سے بعث پارٹی کی حکومت ہے، مصر میں عرب سوشلسٹ یونین پینتالیس سال سے حکمران ہے اور صدر سوہارتو کی گولکا پارٹی تیس برس سے انڈونیشیا پر چھائی ہوئی ہے۔

جمہوری حزب اختلاف کا وجود صرف اس صورت میں ممکن ہے جب اس کے لیے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے ذریعے اقتدار میں آنے کے امکانات ہوں۔ ایسے امکانات و مواقع کی عدم موجودگی میں کسی جمہوری حزب اختلاف کی توقع عبث ہے۔ اس لیے اسلامی تحریکوں سے ان کی جمہوریت سے وابستگی کے تصدیق نامے اور ثبوت مانگنے سے پہلے ہمیں مشرق وسطیٰ کی حکومتوں سے ان کی جمہوریت پسندی اور جمہوری شہرت کے بارے میں پوچھنا چاہیے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک میں جمہوریت کے پنپنے کے کیا امکانات ہیں؟ یہ حقیقت سب کے علم میں ہے کہ ان معاشروں میں جمہوریت کے مستقبل کا

انحصار اسلامی سیاست کے علم برداروں کے طرز فکر و عمل پر نہیں بلکہ اس بات پر ہو گا کہ مشرق وسطیٰ کی حکومتیں اپنے سیاسی نظاموں کو وسیع تر شرکت اور بار بار کے انتخابات کے لیے کھولنے پر آمادہ ہوں، ایسے انتخابات کے لیے نہیں جیسے مصر میں ہوتے ہیں جہاں عہدہ صدارت کے لیے ایک ہی امیدوار میدان میں ہوتا ہے، انڈونیشیا کی طرز کے انتخاب بھی نہیں جہاں پچھلے تیس برس سے ایک ہی امیدوار مسند اقتدار پر براجمان ہے۔ ان ممالک کے یہ صدور معمول کے مطابق پچانوے فیصد ووٹ حاصل کر لیتے ہیں اور عراق کے صدام حسین تو ان سے دو ہاتھ آگے ہیں اور ۹۹.۹ فیصد ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ اور باقی اسلامی دنیا میں کتنے حکمران ہیں جو جمہوری انتخابات کے ذریعے سے اقتدار میں آئے؟ ان کو کیا حق ہے کہ وہ اسلام پرستوں کو جمہوریت کے لیے خطرہ قرار دیں؟ جیسے کہ ان معاشروں میں سیاسی افق پر اسلام پرستوں کے نمودار ہونے سے پہلے جمہوریت موجود تھی اور اب ان کے آنے سے جمہوریت کے وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ سوہارتو اس وقت اقتدار میں آئے جب تیس برس پہلے میں جامعہ کراچی میں بی۔اے کا طالب علم تھا۔ ان کے سامنے آٹھ امریکی صدر آئے اور آکر چلے گئے۔ قذافی اور حافظ الاسد کی آمد کے وقت میں بیروت کی امریکی یونی ورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ حسنی مبارک پندرہ برس سے مسلسل اقتدار میں ہیں اور جب تک رہ سکیں، رہنے کے لیے منصوبے بنا رہے ہیں۔

ان معاشروں میں عموماً حکومت دو ہی طرح سے بدلتی ہے: حکمران مرجائے یا اسے مار ڈالا جائے۔ ایسے سیاسی نظام میں جمہوری حزب اختلاف کیونکر وجود میں آسکتی ہے جہاں حکمران عمر بھر کے لیے کرسی اقتدار سے چپک جائیں اور اپوزیشن کے لیے کبھی بھی اقتدار میں آنے کا کوئی راستہ نہ چھوڑیں، جہاں پرامن اختلاف کرنے والوں کو روکا جائے، دھمکایا جائے، جیل بھیجا جائے، تشدد کا نشانہ بنایا جائے، اور انھیں اظہار خیال کے ہر ذریعے سے محروم رکھا جائے۔ ان کے لیے سیاسی اقتدار میں شرکت کے مواقع کا تو ذکر ہی نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ وفاداری کس کی؟ کیا ان غاصب حکمرانوں کی جو سیاسی قتل، فوجی بغاوتوں، موروثی حقوق اور انتخابی ڈراموں کے ذریعے سے حکومت میں آئے ہیں؟ صاف ظاہر ہے کہ ایسے حکمرانوں کے نہ حزب اختلاف کے سیکولر گروہ وفادار ہو سکتے ہیں نہ اسلامی۔ مروجہ سیاسی نظام سے وفا اس سوال کا دوسرا پہلو ہے۔ جواب پھر نفی میں ہے۔ اس لیے کہ بہت سے مسلمان ممالک میں رائج سیاسی نظام کو ابھی تک اتفاق رائے حاصل نہیں ہوا ہے۔ بعض مقامات پر اسلام پرستوں نے نظام کو قبول کر کے مروجہ قوانین کے مطابق سیاسی عمل میں شرکت کا فیصلہ کیا تو برسر میدان، دوران کھیل، کھیل کے قواعد بدل دیے گئے۔

مصر، الجزائر اور اردن میں انتخابی قوانین صرف اس لیے بدل دیے گئے کہ اسلام پرستوں کا راستہ روکا جا

سکے۔ اسلام پرستوں نے ۱۹۷۱ میں انڈونیشیا کے پہلے پارلیمانی انتخابات میں ۹۰ نشستیں حاصل کر لیں۔ اس پر قوانین میں یہ تبدیلی عمل میں لائی گئی کہ آیندہ پارلیمانی ارکان کی ۳۳ فی صد تعداد صدر مملکت کی نامزد کردہ ہو گی اور ۲۸ فی صد ارکان کو علاقائی گورنر نامزد کریں گے۔ انڈونیشیا کی پارلیمان کی موجودہ صورت حال کو نہضتہ العلما کے قائد یوسف ہاشم نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ انڈونیشی پارلیمان پر چار "ڈ" غالب ہیں۔ پہلا ڈ' ہے ڈاٹانگ' یعنی آیئے' دوسرا ڈوڈک' یعنی تشریف رکھیے' تیسرا ہے ڈیان' یعنی ذرا خاموش رہیے اور آخری ڈ' ہے ڈیواٹ جس کے معنی ہیں لیجیے کچھ پیسے رکھ لیجیے۔ انڈونیشیا میں پارلیمان کو چلانے کا یہی طریقہ ہے اور یہ طریقہ مشرق وسطیٰ کے دوسرے بہت سے ممالک سے مختلف نہیں ہے۔

اس سب کچھ کے علی الرغم اسلامی جماعتیں پچھلے تیس برسوں میں انڈونیشیا اور دوسرے بہت سے مسلمان ممالک میں مسلسل کوشاں رہی ہیں کہ وہ مروجہ نظام کی حدود و قیود میں رہتے ہوئے کام کرتی رہیں' آئین کی پابندی کریں اور قانونی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے چلیں۔ لیکن اس کا کیا کیجیے کہ قانونی ڈھانچہ بھی انھی کو نقصان پہنچانے' انھی کی راہ روکنے کے لیے بدلتا رہتا ہے۔ انھوں نے دیانت داری سے کھیل کے تمام قواعد کی پابندی کی ہے اور جمہوری حزب اختلاف کا کردار ادا کیا ہے مگر کس قدر المناک ستم ظریفی ہے کہ جمہوریت کی بقا اور قانون کی حکمرانی کے تحفظ کے نام پر سیاسی اسلام کی ممکنہ آمریت الجزائر' مصر اور تیونس کی حکومتوں نے فوجی آمریتوں اور فوجی عدالتوں کو قبول کیا' سیاسی آزادیوں پر پابندی اور ہزاروں سیاسی مخالفین کو فرد جرم عائد کرنے اور مقدمات چلانے کا تکلف کیے بغیر قید و بند اور طاقت سے کچلنے کی راہ اختیار کی۔ مصر میں دو درجن سے زائد لوگوں کو فوجی عدالت نے کسی بھی قسم کی اپیل کے بغیر سزائے موت دی۔ یہ حقوق انسانی کی بدترین خلاف ورزیاں ہیں اور اب یہ حکمران چاہتے ہیں کہ ان کے مغربی اتحادی ان کے بارے میں رائے قائم کرتے وقت ان کا تقابل ان فرضی و خیالی اسلامی حکومتوں سے کریں' جن کا کہیں وجود نہیں مگر جو ان کے خیال میں موجودہ مسلمان حکومتوں سے کہیں زیادہ جابر ہوں گی۔ اگر موجودہ حکمران کمزور پڑ گئے تو اسلام پرست آ جائیں گے۔ یہ حکمران اپنے آپ کو مغربی اتحادیوں کے خصوصی سلوک کا مستحق سمجھتے ہیں کیونکہ اولاً وہ ایک خصوصی خطرے کا مقابلہ کر رہے ہیں اور ثانیاً" اسلام کے خطرے کے خلاف مغرب کا دفاع کر رہے ہیں۔

یہ سوال کہ سیاسی اسلام' جمہوری حزب اختلاف کا کردار ادا کر سکتا ہے یا نہیں کوئی دینی سوال نہیں' یہ ایک عمرانی اور سیاسی سوال ہے۔ اس کا جواب اسلام کی دینی تعلیمات یا مذہبی فکر میں نہیں ملے گا۔ اس کا جواب اسلامی معاشروں کی سیاسی اور سماجی صورت حال کے مطالعے ہی سے ممکن ہے۔ اسلام پرست یا جن کو یہاں اسلامی بنیاد پرست کہا جاتا ہے' مغرب کے عام تصور کے مطابق نہ علما ہیں' نہ محض مذہبی موشگافیاں

کرنے والے ماہرین علم کلام و جدلیت اور نہ محض فقیہ۔ اس کے برعکس وہ ہر اعتبار سے باقاعدہ سیاسی لوگ ہیں، سیاست دان کی تعریف پر پورے اترنے والے۔

ہمیں اس بات کو بھی نہ بھولنا چاہیے کہ سیاسی اسلام، اسلامی معاشروں میں پائے جانے والے مذہبی، فکری، نظریاتی اور سیاسی راستوں میں سے ایک راستہ ہے، اسلامی دنیا میں اور بھی بہت کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے جسے بدقسمتی سے سی این این اور نیویارک ٹائمز رپورٹ نہیں کرتے۔ یہ مذہبی اور فکری راستے جو زیادہ نہیں تو اتنے ہی اسلامی و دینی ہیں، کسی وقت اس سیاسی اسلام کے لیے چیلنج ثابت ہو سکتے ہیں، جسے ۱۹۸۰ کے عشرے میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ وسیع المشرب اور جدید اسلام بھی کسی وقت سیاسی اسلام کے مقابل اٹھ کھڑا ہو۔ جنوب اور جنوبی ایشیائی ممالک میں روایتی مذہب میں بھی ایک خاموش تر اور غیر سیاسی احیا کا عمل جاری ہے جو مسلم معاشروں میں سیاسی اسلام کے لیے ایک بڑا چیلنج بن سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ترکی، وسطی ایشیا، شمالی افریقہ کے کچھ علاقوں اور ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں ایک صوفی تحریک بھی برپا ہے۔ مزید برآں روایتی اسلام کا establishment یعنی علما ہیں جو سیاسی اسلام کے عروج سے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے ہر وقت جوابی ردعمل کا امکان موجود رہتا ہے۔ مراعات یافتہ مذہبی قوتیں اکثر حکمرانوں کے ساتھ مل جاتی ہیں اور سیاسی اسلام یا بنیاد پرستی کی اٹھتی ہوئی لہر کے خلاف لڑنے کے لیے اتحاد کر سکتی ہیں۔ بدقسمتی سے یہ غیر سیاسی اسلامی تحریکیں مغربی اسکالرز کے مطالعے میں نہیں آتیں اور سی این این کے رپورٹروں کی دسترس سے بھی باہر رہتی ہیں۔

جہاں تک سیاسی اسلام کا تعلق ہے ہم دو قسم کی تحریکوں کے درمیان تفریق کر سکتے ہیں، ایک قسم وہ ہے جو قومی دھارے میں شریک، معتدل اسلامی تحریکیں ہیں، ان میں جماعت اسلامی پاکستان، جماعت اسلامی بنگلہ دیش، رفاہ پارٹی ترکی، نہضتہ پارٹی یا سابق اسلامی رجحان، تحریک تیونس، اخوان المسلمون مصر، اخوان المسلمون اردن، پاس (PAS) ملائیشیا اور نہضتہ العلما انڈونیشیا شامل ہیں۔ یہ سب تحریکیں یا تو باقاعدہ طور پر سیاسی عمل میں شریک ہیں یا موقع ملنے پر امن، قانونی و آئینی اور جمہوری طریقے پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اگر ان کو موقع فراہم کر دیا جائے تو ان کی خواہش ہو گی کہ ان ملکوں کی دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح وہ بھی سیاسی عمل میں شریک ہوں۔ مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ تمام تحریکیں ذمہ دار، جمہوری حزب اختلاف کا کردار بخوبی ادا کر سکتی ہیں۔ بلکہ فی الحقیقت ان میں کچھ، مثلاً ترکی کی رفاہ پارٹی، پاکستان کی جماعت اسلامی، ملائیشیا کی پاس اور اردن کی اخوان المسلمون--- تو پہلے ہی سے جمہوری حزب اختلاف کا کردار ادا کر رہی ہیں۔ دوسرے قلیل تعداد کے انتہا پسند، انقلابی، عسکری، تشدد پسند اور خفیہ

اسلامی گروہ ہیں جو قومی اور بین الاقوامی دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ اس وقت اس سوال میں نہ جایئے کہ ان تحریکوں کو پرتشدد ذرائع استعمال کرنے کی طرف لے جانے والے اسباب اور محرکات کیا تھے۔ مشرق وسطٰی اور شمالی افریقہ کے ممالک میں آج الجزائر' مصر اور اسرائیل ان کا ہدف ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ہم ان گروہوں سے اس بات کی توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ جمہوری طرز کی حزب اختلاف بن سکیں گے۔ کم از کم مستقبل قریب میں ایسا ممکن نہیں یا یوں کہیے کہ متعلقہ ممالک کی سیاسی صورت حال میں کسی بڑی تبدیلی کے بغیر ایسا ممکن نہیں۔

جہاں تک معتدل اسلامی گروہوں کا تعلق ہے مجھے ان کو جمہوری سیاسی اکھاڑے میں آزادانہ مقابلے کی اجازت دینے میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ اولاً جب ساری تگ و تاز کو سیاسی اکھاڑے میں علامتی طور پر' بامعنی اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے حقیقی مقابلہ ہوتا ہے تو نظریاتی موقف کی سختی میں عملی مصلحت کی نرمی شامل ہو جاتی ہے۔ ثانیاً" اسلامی تحریکوں کو جمہوری سیاست میں دوسرے سیاسی افراد اور گروہوں سے اتحاد کرنا پڑیں گے اور اپنے کچھ مرغوب نعروں کو چھوڑنا پڑے گا۔ جب ملائیشیا میں اسلامی احیا کی نقیب مسلم یوتھ موومنٹ سیکولر رویے کی حکمران جماعت اومنو (UMNO) سے جا ملی تو اسے اپنے کئی پسندیدہ اسلامی منصوبے ترک کرنے پڑے۔ اسی طرح ۸۰ کی دہائی میں تیونس کی اسلامی رجحان تحریک نے مرکزی ٹریڈ یونین پارٹی' ہیومن رائٹس لیگ اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ اتحاد کیا' یہاں تک کہ اسے عوامی متحدہ پارٹی اور کمیونسٹوں کے ساتھ بھی اتحاد کرنا پڑا تو اسے اپنے کئی ایک اسلامی مطالبات سے دستبردار ہونا پڑا۔ انھی برسوں میں مصر میں اخوان المسلمون نے وفد پارٹی سے اتحاد کیا جو بنیادی طور پر ایک سیکولر اور لبرل پارٹی ہے۔ جماعت اسلامی کو پاکستان کی طویل تاریخ میں انتہائی دائیں بازو سے لے کر انتہائی بائیں بازو تک کی جماعتوں سے اتحاد کرنے پڑے۔ جماعت اسلامی بنگلہ دیش نے حال ہی میں اپنی سابقہ دشمن عوامی لیگ سے اتحاد کیا' اسی عوامی لیگ کے ساتھ جو امیر جماعت اسلامی کو پھانسی دینے کا مطالبہ کرتی رہی۔ نجم الدین اربکان کی رفاہ پارٹی نے حال ہی میں ترکی کے انتخابات میں ۲۱ فی صد ووٹ حاصل کیے۔ اس پارٹی کا نام ملی نظام پارٹی' پھر نظام نو پارٹی' پھر ملی سلامت پارٹی رہا۔ ان مختلف ادوار میں اس نے تمام بڑی سیکولر قومی جماعتوں کے ساتھ اتحاد کیے۔ اسے نام کی تبدیلی کے مرحلوں سے بار بار گزرنا پڑا' اس لیے کہ ہر فوجی انقلاب اور بغاوت کے بعد اس پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا جاتا اور اس کے قائدین کو جیل بھیج دیا جاتا۔ لیکن رفاہ مختلف ناموں کے تحت بار بار زندہ ہوتی رہی۔ یہ ہر جنم میں نظام کے اندر رہتے ہوئے کام کرنے پر تیار رہتی رہی۔

دلچسپ سوال یہ ہے کہ ان دینی جماعتوں کو جمہوری سیاست میں حصہ دار بننے کے عمل میں کون کون سے سمجھوتے کرنے پڑے۔ مثلاً جماعت اسلامی پاکستان کو محترمہ فاطمہ جناح کو اسلامی ریاست کی صدارتی

امیدوار کے طور پر تسلیم کرنا پڑا۔ یاد رہے کہ جماعت کے بانی سید مودودیؒ اپنی پہلے کی تحریروں میں لکھ چکے تھے کہ ایک عورت کسی اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں بن سکتی۔ لیکن چونکہ وہ دوسری جماعتوں کے ساتھ اتحاد کر چکے تھے اس لیے انھیں اپنے موقف میں ترمیم کرنی پڑی۔ ۱۹۸۸ میں جماعت اسلامی نے بے نظیر بھٹو کو ایک اسلامی حکومت کے سربراہ کے طور پر قبول کیا۔ خالدہ ضیا ایک عورت ہوتے ہوئے جماعت اسلامی کے ۲۰ ووٹوں کے بغیر بنگلہ دیش کی وزیراعظم نہ بن سکتی تھیں۔ رفاہ اور اس کے تمام پیش رووں نے ترکی کے سیکولر آئینی ڈھانچے کو تسلیم کیا اور نجم الدین اربکان نے، جو کسی طور پر بھی اس میدان میں نوآموز نہیں ہیں، وعدہ کیا کہ وہ ترکی کے سیکولر آئینی فریم ورک کو قائم رکھیں گے۔ انڈونیشیا کی نہضتہ العلما نے اپنے پلیٹ فارم سے اسلام کا نام تک ہٹا دیا اور لادینی سمت رکھنے والے پانچ ریاستی اصولوں کو اختیار کیا جنھیں پنج شیلا کہتے ہیں۔[7] ان مثالوں سے عیاں ہے کہ اگر اسلامی گروہوں کو جمہوری عمل میں آزادانہ شرکت کرنے کے مواقع ملیں تو وہ نہ صرف سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات اپنے بنیادی قسم کے نظریاتی مطالبات سے بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے مغرب کو ان کا کوئی عمل بھی پسند نہیں آیا۔ اگر وہ ایرانیوں کی طرح جمہوری طریق کار کو پس پشت ڈالیں، انقلابی راستہ اختیار کریں، تو انھیں بلا تامل باغی قرار دے کر ریاستی جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اور اگر وہ جمہوری راستہ اختیار کریں، انتخابات میں حصہ لیں اور کبھی کبھار الجزائر (۱۹۹۲) کی طرح جیت بھی جائیں تو ان پر جمہوریت کو اغوا (ہائی جیک) کر لے جانے کا الزام دھرا جاتا ہے اور "گربہ کشتن روز اول" کے مصداق انھیں فوری طور پر بزور قوت دبا دیا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی سیاسی مصلحتوں اور دستور سیاست کے مطابق دوسرے سیاسی گروہوں سے اتحاد کر لیں، جس طرح انھوں نے تیونس، پاکستان اور بنگلہ دیش میں کیا ـــ تو انھیں موقع پرست، اقتدار کے بھوکے اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کے طعنے دیے جاتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں اور خود کو دیگر سیاسی گروہوں سے الگ تھلگ رکھیں تو انھیں نظریاتی طور پر جامد، ڈھیٹ اور ہٹ دھرم قرار دیا جاتا ہے۔ اسلامی تحریکوں کی مشکل یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ اسلام کے مطابق تبدیلی کا تفصیلی نقشہ پیش کریں تو انھیں فوراً Totalitarian قرار دے دیا جاتا ہے کیونکہ وہ سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی کے ہر شعبے کو قابو میں لانا چاہتے ہیں۔

اس کے برعکس مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جب الجزائر میں ۹۲ میں اسلامی فرنٹ (FIS) کو فوجی کارروائی سے کچل دیا تو امریکی ٹی وی کے ان گنت مبصرین بڑھ چڑھ کر باتیں بناتے تھے کہ FIS کے پاس کوئی پروگرام نہ تھا، ان کا سیاسی منصوبہ غیرواضح، مبہم اور سطحی قسم کا تھا، ان کے پاس کام کا صرف ایک مختصر خاکہ تھا۔ ان سب اعتراضات سے وہ یہ اخذ کرتے کہ ان اسلامی جماعتوں میں اپنے معاشروں کے مسائل سے نمٹنے

کی کوئی صلاحیت نہیں۔

اکثر اوقات یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ اسلامی تحریکوں اور ان زعما کی جمہوریت سے وابستگی حقیقی اور قابل اعتبار (genuine) نہیں، ان کے جمہوریت پسندی کے دعووں کا سبب عالمی بساط پر قبول عام اور جواز حاصل کرنا ہے، یا پھر قومی سیاست میں چند عملی فائدوں کا حصول۔ اس پر میں دو باتیں کہنا چاہوں گا۔ اولاً جیسا کہ ڈنک وث وشاؤ نے کہا ہے: "ایک ناخوشگوار فیصلے کا کڑوا گھونٹ چند دنوں میں اپنی کڑواہٹ کھو بیٹھتا ہے اور بھلا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کیونکہ فیصلہ کرنے والا سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ یوں بھی بسر ہو سکتی ہے"۔

وہ اسے عادی ہو جانے کا عمل قرار دیتا ہے۔ اس کی مثال سویڈن کی کنزرویٹو پارٹی ہے جو ۱۹۱۸ کی جمہوریت دشمن پارٹی سے ۱۹۳۶ کی مکمل جمہوری تحریک بن گئی۔ دو عشروں کے دوران وہ لوگ ریٹائر ہو گئے جنھوں نے جمہوریت کو بادل ناخواستہ قبول کیا تھا اور رہنماؤں کی نئی نسل نے معاملات سنبھال لیے جو حقیقی طور پر جمہوری تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت کا عمل ڈارونی طرز کے انتخاب (selection) کا آغاز کر دیتا ہے۔ یہ جمہوریت پسندوں کے حق میں ہوتا ہے۔ اگر ہم اسلام پرستوں کی موجودہ قیادت کے جمہوریت پسند ہونے کے دعووں کو موقع پرستی یا حکمت عملی بھی قرار دیں تو یہ یقین کرنے کی معقول وجوہ ہیں کہ جمہوری نظام میں کام کرنے سے یہ موقع پرستانہ تعلق، اگلی نسل کے رہنماؤں اور کارکنوں میں زیادہ موثر اور حقیقی تعلق میں تبدیل ہو جائے گا۔ میرے خیال سے یہ بھی اس کے بغیر ممکن نہیں ہو گا کہ اسلام پرستوں کو جمہوریت میں سیاسی اقتدار کے مواقع نظر آئیں۔

مختلف دینی یا دیگر سیاسی گروہوں کے جمہوری حزب اختلاف بنے رہنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان معاشروں میں اقتدار کی سخت گرفت کچھ ڈھیلی پڑے اور سیاسی اثر و نفوذ کی مرکزیت کا موثر اور بامعنی خاتمہ ہو۔ ایک وفاقی جمہوری نظام میں اس طرح کا اہتمام بالکل ممکن ہے کہ ایک انتخاب جیتنے والا سبھی کچھ نہ لے اڑے اور حکومت و قوت میں بہت سے لوگ حصہ دار بن سکیں۔ مرکزی یا وفاقی، صوبائی اور مقامی حلقوں کی بنیاد پر قائم نظام میں انتخابی عمل کے کئی درجات اور سطحیں ہوتی ہیں اور اس بات کا ہر وقت امکان رہتا ہے کہ کوئی جماعت مرکز یا وفاق میں شکست کھا جائے اور حکومت نہ بنا سکے مگر صوبائی سطح پر انتخاب جیت کر وہاں کی حکومت میں آ جائے۔ اس طرح ایک ہی پارٹی وفاقی سطح پر انتخاب جیت کر وہاں کی حکومت میں آ جائے۔ اس طرح ایک ہی پارٹی وفاقی سطح پر حزب اختلاف اور صوبائی یا علاقائی سطح پر حزب اقتدار کا کردار بیک وقت ادا کرے۔ اس کی بہترین مثال ملائیشیا میں ملتی ہے۔

ملائیشیا کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز پر نظر رکھنے والے لوگ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ قومی اور وفاقی سطح پر حکمران اومنو (UMNO) اور پچھلے برس سے کم از کم تین ریاستوں میں غالب و حکمران اسلامی جماعت، پاس (PASS) میں ایک کارگر تعلق استوار چلا آ رہا ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر مجھے کلنتان جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پاس دوسری مرتبہ حکومت میں آئی ہے۔ پہلی بار اس نے ریاست کلنتان کی اسمبلی میں ۹۹ فیصد نشستیں جیتیں۔ درحقیقت انھیں خود ہی اس بات کا اہتمام کرنا پڑا کہ کم از کم ایک رکن حزب اختلاف سے بھی منتخب ہو جائے ورنہ اسمبلی کی کارروائی بالکل ہی بے مزہ ہو جاتی۔ پاس ایک مرتبہ پھر جیت گئی ہے اور اومنو (UMNO) جو کہ وسیع البنیاد جماعت ہے اور قومی وفاقی سطح پر حکمران ہے، کلنتان میں ریاستی سطح پر جمہوری حزب اختلاف کا کردار ادا کرتی ہے اور قومی سطح پر اومنو کی حکمرانی ہے اور پاس جمہوری حزب اختلاف ہے۔ پاکستان میں ۱۹۷۰ کی دہائی کے وسط میں بے نظیر بھٹو کے والد مرکز میں وزیراعظم تھے اور صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں جو حکومتیں قائم تھیں وہ اسلامی جماعتوں کے زیر اثر تھیں۔ سب جانتے ہیں کہ ترکی میں رفاہ نے بہت سے اہم شہروں اور قصبوں کے انتخابات جیتے ہیں اور اس میں استنبول کے میئر کی نشست بھی شامل ہے۔ ان تمام مثالوں سے عیاں ہے کہ جب اسلامی جماعتیں جمہوری نظام کا حصہ بنتی ہیں تو انھیں بھی نظام کے اندر کچھ نہ کچھ داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔ انھیں اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ ماتحت درجے ہی میں سہی، قوت و اقتدار میں حصہ دار بنیں۔ یوں اس جمہوری نظام سے ان کے اپنے مفادات وابستہ ہو جاتے ہیں جو ان کو حکومت میں آنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس طرح جب ان کے اپنے مفادات اسی نظام سے وابستہ ہو جائیں تو وہ نہایت سنجیدگی سے اس عمل میں شریک ہو جاتے ہیں جسے امریکی انتظامیہ کے لوگ بین الحکومتی تعلقات کہتے ہیں، یعنی وفاقی سطح پر سیکولر جماعت کے ساتھ مذاکرات، سمجھوتے، سودے بازی اور محاصل میں شرکت۔

میں یہاں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ مختلف اسلامی دانش وروں کے جمہوریت کے بارے میں کیا خیالات ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جن کا جنوب مشرق اور وسطی ایشیا اور شمالی افریقہ تک کی تمام اسلامی تحریکوں کی نظریاتی تربیت میں بہت حصہ ہے، جمہوریت اور جمہوری عمل کے بہت بڑے داعی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی تحریک کے اولین مرحلے میں جب اخوان المسلمون خفیہ قسم کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگی تو مولانا مودودیؒ ہی تھے جنھوں نے اخوان کے قائدین اور کارکنوں سے ملاقات کی اور انھیں پرتشدد سرگرمیوں سے روکا۔ اس مسئلے پر مولانا مودودیؒ دو ٹوک موقف رکھتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ کوئی تبدیلی جو قتل، محلاتی سازشوں اور فوجی بغاوتوں جیسے انقلابی ذرائع کے ذریعے سے آئے، اسلامی نہیں ہو گی۔ ان کے نزدیک مقاصد کے ساتھ ساتھ ذرائع کا اخلاقی ہونا بھی

ضروری ہے۔ اسی طرح النہضہ تحریک تیونس کے سربراہ، شیخ عبدالرشید الغنوشی بھی کثیرالجماعتی جمہوریت کے بہت بڑے حامی ہیں۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کوئی بھی اسلامی جماعت عوام کے قلب و ذہن میں تبدیلی کے لیے قوت کا استعمال نہ کر سکتی ہے نہ اسے کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا کام اپنے پیغام کی پرامن، قانونی اور جمہوری طریقوں سے تبلیغ کرنا ہے۔ اگر لوگ ہمارے پیغام کو قبول کر لیں اور ہمارے حق میں رائے دیں تو اس میں ہم دونوں کا بھلا ہے اور اگر وہ ہمیں رد کر دیں تو بھی ہم ان کی رائے کا احترام کریں گے۔

انگلستان سے شائع ہونے والے ایک اسلامی رسالے Encounter کی قریبی اشاعت میں اخوان المسلمون، مصر کی طرف سے جاری کردہ ایک بیان کو دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ اس بیان میں اخوان نے دو ٹوک طریقے پر کثیرالجماعتی سیاسی نظام کو کسی بھی قسم کے تامل اور شرائط اور تحفظات کے بغیر قبول کیا ہے۔ وہ نہ صرف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام، جمہوریت کی اجازت دیتا ہے بلکہ یہ تک کہتے ہیں کہ اسلامی تحریکوں کی بقا اور نشوونما صرف اس ماحول میں ممکن ہے جہاں مختلف الخیال سیاسی گروہوں کو آزادانہ سرگرمیوں کی اجازت ہو۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ہمارے خیال میں اسلامی تحریکوں کی جمہوریت سے وابستگی دائمی و حقیقی اور موثر قسم کی بجائے صرف مصلحت آمیز، وقتی یا ضرورت کے تحت بھی ہو تو بھی اس کا احترام کیا جانا چاہیے۔ اسلامی تحریکوں نے فوجی آمریت کے تحت ہی سختیاں جھیلی ہیں اور جمہوری صورت حال کے تحت کبھی نہیں۔ ترکی کے فوجی انقلابوں کے نتیجے میں رفاہ پارٹی کو تین دفعہ غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور اس کے قائدین کو جیل بھیج دیا گیا۔ انھیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں اور ایک لیڈر کو موت کی سزا دے دی گئی۔ سارتو کی فوجی قیادت کے تحت وہاں کی اسلامی تحریک نے سب سے زیادہ سختیاں جھیلیں۔ محمد ایوب خان کے مارشل لا اور فوجی قیادت ہی میں ممکن ہوا کہ جماعت اسلامی پاکستان پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔ صرف جمہوری عمل ہی تھا جس نے انھیں آزادانہ سرگرمیوں کی اجازت دی اور مقابلے کی سیاسی کش مکش میں اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا۔

اسی لیے اسلام پرست، جمہوریت کو خود اپنی بقا کی ضمانت سمجھتے ہیں۔ وہ جمہوریت کے مشن کے سب سے بڑے حامی اور دعویدار ہیں۔ یہ صرف ایک آزاد، اور جمہوری بنیاد پر قائم سیاسی ڈھانچہ ہے جس میں انھیں شریک ہونے کی اجازت ملی، ترکی میں، پاکستان میں، اردن میں اور بنگلہ دیش میں اور نہ کہ مصر، تیونس یا الجزائر میں اور ہم عراق، شام اور لیبیا کے بارے میں تو بات ہی نہیں کر رہے۔ صاف ظاہر ہے کہ معمر قذافی، صدام حسین اور حافظ الاسد کے خلاف کسی جمہوری حزب اختلاف کے بننے یا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سوال : ترکی میں بہت سے مبصرین کا کہنا ہے کہ فوجی حکومت نے اسلامی سیاست کو نظرانداز کیا بلکہ کیمونسٹوں کا زور توڑنے کے لیے اس کی حمایت کی۔ اگر آپ مساجد کی تعمیر کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ ان کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوا۔ یہ اس سے بالکل مختلف بات ہے جو آپ نے فرمائی ہے کہ فوجی حکومتوں میں اسلامی سیاست کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا؟

جواب : آپ کی بات سے میری بات کی تردید نہیں ہوتی کہ ہر فوجی انقلاب کے وقت اسلامی تحریک کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور سیاسی عمل میں شرکت سے محروم کر دیا گیا۔ جو آپ نے فرمایا اس میں بھی کچھ نہ کچھ حقیقت ہے۔ بہت سے مبصرین کا خیال ہے کہ ۱۹۷۰ کی دہائی میں انتہا پسند دائیں اور بائیں بازو کی کش مکش کے دوران ترکی میں فوج نے اعتدال پسند اسلامی گروہوں کو سیاسی عمل میں شامل ہونے پر ابھارا تاکہ کیمونسٹ خطرے کا توڑ ہو سکے۔ بہرحال یہ بات قابل غور ہے کہ ایک معروف ترک ماہر سیاسیات اوزبودین' اربکان کی زیر قیادت اسلامی رفاہ' پارٹی کو بھرپور خراج عقیدت پیش کرتا ہے کہ یہ ۱۹۷۰ کی دہائی کے اواخر میں ہر قسم کی سیاسی دہشت گردی اور تشدد سے دور رہی۔ درحقیقت ۱۹۷۰ کی دہائی میں یہی ایک سیاسی جماعت تھی جس نے تمام بڑی بڑی سیاسی قوتوں کے ساتھ روابط جاری رکھے جب کہ بڑی سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے گفتگو تک کے مراسم ختم کیے ہوئے تھیں۔ یہ اربکان ہی تھے جو ان دونوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنے اور انھوں نے بہت ہی مثبت کردار ادا کیا۔

یہ رفاہ کا وعدہ ہے کہ وہ ترکی کے سیکولرازم کے سوال کو دوبارہ نہیں اٹھائے گی۔ درحقیقت اربکان نے یہ کہا تھا کہ وہ ترکی کے سیاسی نظام کے سیکولر آئینی ڈھانچے کو قائم رکھے گا اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اسے اپنے سیاسی پلیٹ فارم اور منشور میں اسلام کے نام کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ اس کی پارٹی صرف قومی اہداف اور اخلاقی معیارات کی بات کرتی ہے جو اسلام کے لیے ان کی علامت ہے۔ ان تمام احتیاطی اقدامات کے باوجود اربکان جانتے ہیں' میرے خیال میں انقرہ میں رہنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ رفاہ ترکی کی فوجی انتظامیہ سے پیشگی سمجھوتے اور افہام و تفہیم کے بغیر اقتدار میں نہیں آ سکتی۔ رفاہ اور فوج کے درمیان کسی نہ کسی سمجھوتے کا طے پانا ضروری ہے۔ یہ سمجھوتہ ترکی کے مغرب سے تعلقات کی نوعیت' معاشی منصوبوں کی نوعیت' ترکی کی مشرق وسطی کے متعلق پالیسی اور اس سے بھی کہیں زیادہ اہم اسلام کے حوالے سے ترکی کے سیاسی نظام اور سیکولر آئین کی سالمیت کا سوال ہے۔ یہ وہ بنیادی عنوانات ہیں جن پر رفاہ اور فوجی انتظامیہ کو کسی نہ کسی اتفاق رائے پر پہنچنا ہو گا' تب ہی فوجی انتظامیہ رفاہ کو اس بات کی اجازت دے گی کہ وہ وزیراعظم کا تقرر کریں' کابینہ تشکیل دیں یا کسی مخلوط حکومت میں شریک ہوں۔

چند تبصرے جو میں نے ترکی کے انتخابی نتائج کے اعلان کے فوراً بعد پڑھے ان سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ نجم الدین اربکان اور رفاہ پارٹی کے ۲۱ فی صد ووٹ حاصل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی افق پر ایک اور خمینی نمودار ہو رہا ہے۔ ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جب ہم اربکان کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ہم ایک ایسے شخص کے بارے میں بات کر رہے ہیں جو اپنی ٹیم کو ساتھ لے کر چلتا ہے، جو ترکی کے سیاسی نظام کا پچھلے پینتیس برس سے اہم حصہ ہے۔ وہ اور اس کی پارٹی تقریباً ہر مخلوط حکومت کا حصہ رہی ہے اور پچھلے تیس پینتیس برس کا عرصہ انھوں نے ایک جمہوری حزب اختلاف کے طور پر گزارا ہے۔ خود اربکان ترکی کے نائب وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہم کسی ایسے خمینی کے بارے میں بات نہیں کر رہے جو ماضی کی سیاست میں ایک غیر معروف حیثیت کا حامل ہو اور اچانک دارالسلطنت میں اترے اور سب کو فتح کر لے۔

س: اگر آپ اسرائیلی حکومت اور فلسطینی قومی مقتدرہ (Palestineian National Authority) کو رہنمائی فراہم کر رہے ہوں کہ وہ اسلامی تحریکوں بالخصوص حماس اور اسلامی جہاد کے ساتھ کس طرح معاملہ کریں تو آپ کیا کہیں گے؟

ج: اسرائیلیوں نے اس وقت میری رائے جاننا نہ چاہی جب وہ پی ایل او کی قوت اور اثر کو کم کرنے کے لیے حماس کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے۔ اب جب کہ ان کے عمل کا نتیجہ ظاہر ہو رہا ہے اور ان کا کیا خود ان کے گلے پڑ رہا ہے تو وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ حماس سے کیسے نپٹا جائے۔ میرے خیال میں انھیں خود اپنی پرانی جاسوسی رپورٹوں کی ورق گردانی کرنی چاہیے جس سے انھیں معلوم ہو گا کہ انھوں نے فلسطینی سیاست پر سے پی ایل او کی اجارہ داری توڑنے کے لیے کس طرح انقلابی اسلامی متبادل کی پذیرائی شروع کی تھی۔ اس چیز کے ثبوت اسرائیلی اور فلسطینی مصنفین کی تحریروں میں بہت واضح طور پر ملتے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو جلد ہی اسرائیلی سیاسی منظر پر ظاہر ہوں گی اگر امن کا وہ عمل، جس پر اسرائیل نے فلسطینیوں کے ساتھ دستخط کیے ہیں بخیر و خوبی انجام پاتا ہے اور ہر چیز اپنے وقت پر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ انقلابی اسلامی حماس کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ ساتھ ہی اگر اسرائیل، شام اور لبنان کی حکومتوں کے ساتھ کوئی معاہدہ کر لیتا ہے اور جنوبی لبنان کو جسے امریکی میڈیا عادتاً اسرائیل دفاعی علاقہ کہہ کر اشارہ کرتا ہے، چھوڑ دیتا ہے، تو اسرائیل کی شمالی سرحدوں پر تشدد کا ایک بہت بڑا سبب ختم ہو جائے گا۔ میرے خیال میں یہ دو باتیں انقلابی اسلامی تحریک کو کمزور کریں گی اور اسے موثر طریقے سے راستے سے ہٹا دیں گی۔ تیسری بات یہ ہے کہ حال ہی میں مشرق وسطی میں دہشت گردی پر ہونے والی کانفرنس، جس میں صدر کلنٹن بھی موجود تھے، کا نتیجہ بھی اس شکل میں ظاہر ہو گا کہ ان تمام گروہوں میں باہمی تعاون کئی گنا

بڑھ جائے گا جو دہشت گرد سرگرمیوں کے نتائج سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ اس حکومتی اور سراغ رساں سطح پر ابھرتے ہوئے تعاون کے نتیجے میں انقلابی اور انتہا پسندانہ گروہ کمزور ہوں گے اور ان کا دائرہ عمل سکڑ جائے گا۔ اسرائیل کے اندر بھی اور مشرق وسطی میں دوسرے حصوں میں بھی۔ چوتھے' میرے خیال میں ان کے مالی ذرائع و وسائل پر بھی کڑی نظر رکھی جا رہی ہے اور وہ خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ میرا احساس یہ ہے کہ آج سے دس پندرہ برس بعد اسرائیلی' حماس کے قائدین کے ساتھ اسی طرح گفت و شنید کر رہے ہوں گے جس طرح آج یاسر عرفات کے ساتھ کر رہے ہیں جسے کل تک ایک دہشت گرد کہا جاتا تھا۔

س : میرا تعلق مصری سفارت خانے سے ہے۔ یہ تحریکیں جمہوریت کا دعویٰ کرتی رہی ہیں اور اسے اپنی بقا کے لیے ناگزیر سمجھتی ہیں۔ لیکن اصل امتحان تو اس وقت ہو گا جب انھیں اقتدار میں آنے کا موقع مل جائے۔ ایران اور سوڈان میں انھوں نے حزب اختلاف پر ظلم و جبر کیا ہے۔ مصر میں یقیناً برطانوی طرز کی جمہوریت نہیں ہے لیکن ہم نے ایک جمہوری عمل شروع کیا ہے' انتخابات ہوتے ہیں' پریس آزاد ہے' کئی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔

ج : خدا کرے مصر اپنے مسائل حل کرنے کے قابل ہو جائے۔ مصر' الجزائر کی طرح کثرت آبادی کا شکار ہے۔ وہاں معاشی اور عمرانی مسائل پائے جاتے ہیں جنھوں نے اسلامی تحریکوں کو کہیں زیادہ مقبول اور موثر بننے میں مدد دی ہے۔ مصر کی سیاسی صورت حال کے آپ کے تجزیے سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ حسنی مبارک انقلابی' خفیہ' عسکری اور تشدد پسند اسلامی گروہوں اور معتدل اخوان المسلمون کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ بات نیویارک ٹائمز میں شائع ہوئی ہے اور اسے ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ریکارڈ کیا ہے کہ انتخابات سے کچھ ہی پہلے اخوان المسلمون کے سیکڑوں ارکان گرفتار کر لیے گئے ان میں سے اکثر ستر سے اسی برس کی عمر کے تھے۔ جب ان پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تو کسی پر بھی یہ الزام نہیں لگایا گیا کہ وہ پر تشدد کارروائیوں میں ملوث تھے۔ ان میں سے پچاس سے زیادہ کو تین سے پانچ سال تک قید کی سزا سنائی گئی۔ یہ سچ ہے کہ جن لوگوں کو موت کی سزا دی گئی ان کا تعلق زیر زمین اسلامی گروہوں سے تھا مگر انھیں یہ سزائیں فوجی عدالتوں نے سنائیں جن کے خلاف اپیل کا حق بھی نہیں۔

پھر ایک نیا پریس قانون جاری کیا گیا ہے جسے تمام انسانی حقوق کی تنظیموں بشمول بین الاقوامی تنظیموں نے ظالمانہ قرار دیا ہے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں حاضرین کو یاد دلاتا چلوں کہ آیت اللہ خمینی کے سلمان رشدی کو ایک کتاب لکھنے پر موت کا فتویٰ جاری کرنے سے کہیں پہلے سید قطب کو مصر میں ایک کتاب لکھنے پر پھانسی دے دی گئی تھی۔ ان پر قطعاً" یہ الزام نہیں لگایا گیا تھا کہ انھوں نے خود کسی پر تشدد کارروائی میں حصہ لیا ہو۔ انھوں نے وہ کتاب لکھی تو وہ جیل میں تھے۔ ان پر الزام یہ تھا کہ انھوں نے ایسے خیالات کی

آبیاری کی جو مصری سیاسی نظام کے لیے بہت خطرناک سمجھے گئے۔ بدقسمتی سے اس وقت کسی نے ان کے مسئلے کو نہ اٹھایا اور نہ ہی ان کے افکار اور اظہار کی آزادی کے حق کا دفاع کیا گیا۔

میں مصر کا مقابلہ شام اور عراق سے نہیں کر رہا۔ مصر پھر بھی ایک کھلا معاشرہ ہے۔ میں مصری قوم کی جمہوریت اور آزادی کے لیے قربانیوں کا احترام کرتا ہوں۔ مصر عرب دنیا کا فکری راہنما ہے۔ لوگ مصر کی جانب دیکھتے ہیں لیکن اس وقت مصر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی طرح بھی نہ تو نظام کی کشادگی قرار دیا جا سکتا ہے نہ جمہوریت کا فروغ۔ ہم اسلام پرستوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہم تمھیں انتخابات میں حصہ نہیں لینے دیں گے کیونکہ ہمارا گمان یہ ہے کہ اگر تم انتخابات جیت گئے تو یہ آخری انتخابات ہوں گے اور تم لوگ جمہوری مشینری کو برباد کر دو گے۔ یہ بہت ہی عجیب بیان ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم پہلے ہی سے فرض کر لیتے ہیں کہ مصر، الجزائر اور تیونس میں جمہوریت قائم ہے اور یہ اسلامی تحریکیں اگر اقتدار میں آگئیں تو وہ ان پھلتی پھولتی جمہوریتوں کو بیخ زمین سے اکھاڑ دیں گی۔ متبادل کیا ہے؟ اسلامی تحریکوں کے اقتدار میں آنے کا متبادل فوجی آمریت ہے۔ یا ایک آمرانہ یک جماعتی نظام جو ہمیں مشرق وسطٰی کے کئی ملکوں میں نظر آتا ہے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ انتخابات جیتی ہوئی اسلامی قوتوں کو اقتدار میں آنے سے روکنے کا کوئی جواز ہے۔ محض اس ڈر سے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ آمر بن جائیں یا آمر ثابت ہوں، جب کہ ان گنت مسلمان ممالک میں آمر پہلے ہی اقتدار پر قابض ہیں۔

س : میں یو ایس آئی اے سے ہوں۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید یو ایس آئی اے ان اسلامی گروہوں کے جمہوری رجحان کو سمجھنے میں غلطی کرتی ہے۔ کیا ہم لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہر وہ شے جس کے نام کا ایک جزو اسلامی ہو ردعمل اور تشدد کی حامل ہو گی؟

ج : تمام اسلامی تحریکیں بنیاد پرست نہیں ہیں۔ نہ تمام بنیاد پرست سیاسی ہیں، اور نہ ہی تمام بنیاد پرست اسلامی تحریکیں تشدد پسند ہیں۔ پچھلے سال جنوری میں، میں ڈھاکہ میں تھا جہاں قریب ہی تبلیغی جماعت کا ایک کنونشن ہو رہا تھا۔ دس لاکھ سے زائد مسلمان اس اجتماع میں جمع تھے اور یہ حج کے بعد دنیا کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ پچھلے برس اس جماعت کا ایک اجتماع لاہور کے قریب پاکستان میں ہوا تھا۔ دنیا بھر سے ۱۵ لاکھ مسلمان اس اجتماع میں شریک تھے۔ یہ اسلامی نشاۃ ثانیہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا سیاست سے دور کا واسطہ نہیں۔ یہ لوگ اسلامی شعور کو ذاتی نیکی کے طور پر پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یوں بہت سی اسی قسم کی اسلامی تحریکیں ہیں جو مسلم معاشروں میں اہم اور فعال ثابت ہو رہی ہیں۔

س : میں ایک ترک صحافی ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ اسلامی رفاہ پارٹی کو ایران اور سعودی عرب سے مالی امداد ملتی ہے۔ آخر سعودی عرب کا ترکی اور سیکولر حکومت کے خلاف اسلامی گروہوں کی پشت پناہی کا کیا مقصد ہے؟

ج : میں تو رفاہ پارٹی کے بیرونی مالی وسائل سے واقف نہیں ہوں۔ البتہ اگر وہ واقعی ایران اور سعودی عرب سے بیک وقت پیسہ لے رہے ہیں تو یقیناً ان کی ہوشیاری قابل رشک ہے۔ افغانستان میں جب کچھ گروہوں نے ایسا کرنا چاہا تو انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ سعودیوں نے کہا کہ اگر تمھیں ایران سے پیسہ مل رہا ہے تو ہم سے کوئی توقع مت رکھو۔ سعودی عرب کا اس میں فائدہ ہے کہ ترک حکومت، مشرق وسطیٰ میں ہونے والی پیش رفت میں زیادہ دلچسپی لے، خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ ترکی کی سرحدیں عراق اور شام سے ملتی ہیں۔ سعودی عرب کے ترکی سے نظریاتی نہ سہی اسٹرے ٹیجک مفادات وابستہ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جب روس کے زوال پر پانچ مسلمان ریاستیں آزاد ہوئیں تو ترکی، سعودی عرب اور ایران ان نئے آزاد ہونے والے مسلمانوں کے دل جیتنے کے لیے ایک دوسرے کے رقیب بن گئے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ نجم الدین اربکان بہت عرصے تک سعودی امداد یافتہ (sponsored) ادارے، رابطہ عالم اسلامی کے رکن رہے ہیں۔ شاہ فیصل کے ساتھ ان کے بڑے قریبی ذاتی تعلقات تھے۔ لیکن آج کل میرا خیال نہیں کہ ان کی پارٹی اور سعودی حکام کے کوئی تعلقات ہیں۔ ایرانی حکومت کو اربکان کے ساتھ کبھی کوئی ہمدردی نہیں رہی۔

س : میرا تعلق تیونس کے سفارت خانے سے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تیونس کی نہضتہ کے سربراہ راشد غنوشی اپنی اعتدال پسندی کے لیے جانے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ غنوشی ملک کے اندر قتل کی سازشیں اور تشدد کی سکیمیں تیار کر رہا تھا۔ میرے خیال میں اعتدال ان سرگرمیوں کی مکمل نفی ہے۔ ۱۹۸۷ کی تبدیلی کے بعد سے حکومت نے اس تحریک کو سیاسی عمل میں شرکت، قومی معاہدے پر دستخط کرنے کی اجازت دی۔ یہ معاہدہ سیاسی زندگی کی تنظیم کرتا ہے لیکن اس کے بعد یہ تحریک تشدد کی راہ پر چل نکلی۔ ہر روز ہڑتالیں ہوتیں اور تشدد کی کارروائیاں ہوتیں۔ اب جب کہ نہضتہ نہیں ہے، ہم اس علاقے کے اور افریقہ کے محفوظ ترین اور پرامن ترین ملکوں میں سے ہیں۔

ج : جو کچھ آپ نے فرمایا ہے میں اس کی تحقیر نہیں کرنا چاہتا لیکن جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کا بیان تیونس کی حکومت کے سرکاری نمایندوں کا بیان ہے۔ آپ کا فرض تھا کہ آپ یہی کہتے اور آپ نے اپنے فرض کو بخوبی نبھایا۔ لیکن بہرحال، ایمنسی انٹرنیشنل کی حالیہ رپورٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۳۵ ہزار لوگ بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں پڑے ہیں۔